کر کے پٹھانوں کو یہاں سے نکال دیں۔" اس کے بعد شیخ معزالدین نے گھر کا زیور بیچ کے فوج جمع کی اور سارے شیخ زادوں کو لے کے کوتوال پر حملہ کیا۔ وہ اپنی جان لے کے بھاگا اور شیخ صاحب نے کسی مغل کو درباری لباس پہنا کے اپنے مکان میں بٹھا دیا اور منادی کرا دی کہ صفدر جنگ نے اپنی طرف سے اس مغل کو کوتوال بنا کے بھیجا ہے۔ اس کے ساتھ ہی علیؓ کے نام کا ایک سبز جھنڈا کھڑا کیا۔ اور لوگ اُس کے نیچے آ آ کے جمع ہونے لگے۔

یہ حالات سُن کے پٹھانوں نے حملہ کر دیا۔ شیخ زادوں نے جان توڑ کے مقابلہ کیا۔ اور اپنی پُرانی شجاعت دکھا دی۔ پٹھان مقابلے کی تاب نہ لا سکے، پندرہ ہزار فوج کے ساتھ بھاگے۔ اور موقع پا کے شیخ زادوں نے پٹھانوں کو سارے ملک اودھ سے نکال باہر کیا۔

دو سال بعد جب احمد خاں بنگش سے صلح ہو گئی تو ۱۱۸۲ھ محمدی (۱۷۶۸ء) میں نواب صفدر جنگ پھر لکھنؤ میں آئے اور مہدی گھاٹ پر آ کے ٹھہرے۔ ایک خاص مکان اپنے رہنے کے لیے بنوایا اور سجایا اور سپاہ کی درستی میں مصروف ہوئے لیکن اس کی مہلت نہ ملی۔ اُسی سال سلطان پور کے قریب پاپڑ گھاٹ میں پڑاؤ تھا کہ انتقال کیا۔ لاش پہلے فیض آباد کی گلاب باڑی میں لے جا کے زمین کے سپرد کی گئی۔ پھر تھوڑے دنوں کے بعد ہڈیاں دہلی میں لے جا کے دفن کی گئیں، جن پر نہایت ہی عالی شان مقبرہ موجود ہے۔ اور سیاحانِ ارض اسے آج تک عبرت و عزّت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

(۴)

صفدر جنگ منصور علی خاں کے انتقال کے بعد ۱۱۸۲ھ محمدی (۱۷۶۸ء) میں اُن کے بیٹے نواب شجاع الدولہ مسندنشین ہوئے، جن کے کچھ حالات اس مضمون کے پہلے حصّے میں بیان ہو چکے ہیں۔ وہ ایک مضطرب اور بے قرار طبیعت کے اولوالعزم فرماں روا تھے لیکن بدقسمتی سے اُن کا عہد بڑے بڑے فتنوں اور یادگارِ زمانہ انقلابوں سے بھرا ہوا تھا۔ دنیا کی دو زبردست تاریخی قوموں اور قوتوں کی قسمت کا فیصلہ انھی کی آنکھوں کے سامنے

ہوا۔ پہلے پانی پت کی محشر انگیز لڑائی ہوئی جس میں احمد شاہ دُرّانی۔ شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کے ساتھ خوانینِ روہیل کھنڈ کی تمام زبردست فوجیں ایک طرف تھیں اور مرہٹوں کا ٹیڑی دل دوسری طرف۔ اس لڑائی نے ۱۱۹۰ھ محمدی (۱۷۶۱ء) میں ایک ہی دن کے اندر فیصلہ کر دیا کہ ہندوستان چاہے مسلمانوں کا رہے یا نہ رہے۔ مگر مرہٹوں کا نہیں ہو سکتا۔ اُس کے بعد بکسر کا قیامت خیز میدان گرم ہوا جس میں انگریزوں کی باقاعدہ فوج ایک طرف تھی اور شجاع الدولہ کا لشکرِ کثیر ایک طرف۔ اس لڑائی نے، جنگِ پانی پت کے چار سال بعد، ۱۱۹۳ھ محمدی (۱۷۶۳ء) میں چوبیس گھنٹے کے اندر اس بات کا تصفیہ کر دیا کہ ہندوستان اب مسلمانوں کا نہیں، انگریزوں کا ہے۔

ان لڑائیوں سے پہلے، شجاع الدولہ اگرچہ لکھنؤ ہی میں رہے، مگر بڑی بڑی مہموں، پولیٹیکل مشغولیتوں اور فوجی اصلاحوں سے انھیں اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ شہر کی ترقی و آرایش کی طرف توجہ کریں۔ اُنھوں نے قلعے بنوائے، گڑھیاں قائم کیں، فوجی سامان اور آلاتِ جنگ کو فراہم کیا۔ اس کی فرصت نہ ملی کہ اپنے گھر کو درست اور اپنے شہر کو آراستہ کریں۔ بکسر کی لڑائی کے بعد، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، وہ فیض آباد میں جا کے اقامت گزین ہو گئے۔ اس لیے لکھنؤ ان کی برکتوں سے محروم رہ گیا۔ ۱۲۰۴ھ محمدی (۱۷۷۵ء) میں انھوں نے سفرِ آخرت کیا، اور نواب آصف الدولہ اُن کے جانشین ہوئے۔

آصف الدولہ نے مسندِ حکومت پر قدم رکھتے ہی، ماں سے ناراض ہو کے لکھنؤ کی راہ لی۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب سے دربارِ اودھ کی قوّتِ فرماں روائی گھٹنے اور لکھنؤ کی ظاہری رونق بڑھنے لگی۔ بکسر کا میدان جیتنے کے بعد انگریزوں نے دربارِ اودھ میں دخل دہی کے بہت سے حقوق حاصل کر لیے تھے جن کی بنا پر یہاں فوجی ترقیوں کی روک ٹوک کی جاتی اور ہمیشہ غائر نظر سے اس بات کی نگرانی کی جاتی کہ حکومتِ اودھ کو پھر ایسی قوّت نہ حاصل ہونے پائے کہ اُس کی فوجیں دوبارہ انگریزی لشکر کے سامنے صف آرا ہو سکیں۔

تاہم، شجاع الدولہ جب تک فیض آباد میں زندہ رہے، فوجی اصلاح ہی میں مصروف رہے۔ اور رات دن اِسی بات کی دُھن تھی کہ جس طرح بنے اپنی قوت کو بڑھائیں چنانچہ منشی فیض بخش اپنی تاریخ فرح بخش میں اُسی زمانے کا چشم دید حال بیان کرتے ہیں کہ: "جلدی بھرنے اور فیر کرنے کے اعتبار سے شجاع الدولہ کی فوج کی بندوقوں کے مقابلے میں انگریزی فوج کی بندوقیں کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں۔"

لیکن آصف الدولہ کا عہد شروع ہوتے ہی یہ سب باتیں تشریف لے گئیں۔ انگریزوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے دخل دہی کے حقوق کو بڑھانا شروع کیا اور نہایت ہی دانائی سے آصف الدولہ کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ فوجی اصلاح کی طرف سے بے پروا ہو کے، دوسرے مشاغل میں جی بہلائیں۔ آصف الدولہ کو خود بھی فوج کا زیادہ شوق نہ تھا۔ انھیں لُٹانے اور مزے اڑانے کے لیے روپے کی ضرورت تھی، جو بغیر فوج کے موقوف کیے پوری نہ ہو سکتی تھی۔ اِس لیے انھوں نے تھوڑی سی فوج رکھ لی، باقی سب کو معزول کر دیا اور عیش و عشرت میں مصروف ہو گئے۔ وہ اپنے مغربی دوستوں کے اطاعت کیش دوست تھے، جو اُن کے اشاروں پر چلتے اور اُن کے مشوروں کے آگے کسی کی نہ سُنتے۔

اِس خلوصِ عقیدت کے صلے میں، انگریزوں نے روہیل کھنڈ پر ان کا قبضہ کرا دیا۔ اپنی ماں، بہو بیگم صاحبہ کے ستانے اور لوٹنے کے لیے جب انھوں نے انگریزوں سے مدد مانگی، تو نہایت فیاضی کے ساتھ انھیں اخلاقی مدد دی گئی۔ اور ان کی طرف داری کی گئی۔ اس پر بھی ان کے زمانے تک انھیں یا لکھنؤ کی رعایا کو بہت ہی کم محسوس ہو سکا کہ ہمارے نظم و نسق میں کسی بیرونی قوت کو دخل ہے جس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ آصف الدولہ کی عام فیاضی اور عیش پرستی نے ساری رعایا کو بھی عیش پرست و عشرت طلب بنا دیا تھا۔ اور کسی کو موجودہ راحت و آرام کے آگے، انجام پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تھی۔

اس عیش پرستی کا نتیجہ تھا کہ ظاہری صورت میں اُن دنوں لکھنؤ کے دربار میں ایسی شان و شوکت پیدا ہو گئی جو کہیں اور کسی دربار میں نہ تھی۔ اور ایسا سامانِ عیش جمع ہو گیا تھا جو کسی جگہ نہ نظر آتا۔ اُن دنوں شہر لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان ہی نہیں، شاید دنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج و عروج کا مقابلہ نہ کر سکتا ہو گا۔ شجاع الدولہ جو روپیا فوج اور جنگی تیاریوں میں صرف کرتے تھے، اُسے آصف الدولہ نے اپنی عیش طلبی کے ذوق اور شہر کی آرایش و خوش حالی میں صرف کرنا شروع کر دیا اور چند ہی روز کے اندر ساری دنیا کی دھوم دھام اپنے یہاں جمع کر لی۔ اُن کا حوصلہ بس یہی تھا کہ نظام حیدر آباد ہوں یا ٹیپو سلطان کسی دربار کا کروفر اور کسی کی شوکت و حشمت، میرے دربار سے زیادہ نہ ہو سکے۔

اپنے بیٹے وزیر علی خاں کی شادی میں انھوں نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا ترک و احتشام تاریخ ارض کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا۔ برات کے جلوس میں بارہ سو ہاتھی تھے۔ دولھا جو شاہی خلعت پہنے تھا، اُس میں بیس لاکھ کے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ محفلِ طرب کے لیے دو عظیم الشان اور پر تکلف خیمے بنوائے گئے جن میں ہر ایک ۶۰ فٹ چوڑا ۱۲۰۰ فٹ لمبا اور ۶۰ فٹ بلند تھا۔ اور ایسا عمدہ، نفیس اور قیمتی کپڑا لگایا گیا تھا کہ اُن دونوں کی تیاری میں سلطنت کے دس لاکھ روپے صرف ہو گئے۔

اُنھوں نے دریا کنارے مچھی بھون کے مغرب طرف دولت خانہ، رومی دروازہ اور اپنا یکتائے روزگار امام باڑا تعمیر کرایا۔ ۱۲۱۳ھ محمدی (۱۷۹۸ء) میں اودھ میں قحط پڑ گیا تھا اور شرفائے شہر تک فاقہ کشی میں مبتلا تھے۔ اُس نازک موقع پر رعایا کی دست گیری کے لیے امام باڑے کی عمارت چھیڑ دی گئی۔ چونکہ شریف لوگ دن کو مزدوری کرنے میں اپنی بے عزتی خیال کرتے تھے، اس لیے تعمیر کا کام دن کی طرح رات کو بھی جاری رہتا۔ اور غریب و فاقہ کش شرفائے شہر رات کے اندھیرے میں آ کے مزدوروں میں شریک

ہوجاتے اور مشعلوں کی روشنی میں کام کرتے۔ اس عمارت کو نوّاب نے جیسے خلوصِ عقیدت اور جوشِ دین داری سے بنوایا تھا، ویسے ہی خالص اور سچّے دلی جوش سے لوگوں نے تعمیر بھی کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی نفیس اور شان دار عمارت بن کے تیار ہوگئی، جو اپنی نوعیّت میں بے مثل اور نادرِ روزگار ہے۔ اُس کا نقشا بنانے کے لیے بڑے بڑے مشہور مہندس اور معمار بلائے گئے اور سب نے کوشش کی کہ ہمارا نقشا، دوسروں کے مجوّزہ نقشے سے بڑھ جائے مگر کفایت اللہ نام ایک بے مثلِ زمانہ معمار کا نقشا پسند کیا گیا اور اُسی کے مطابق عمارت بننا شروع ہوگئی۔ جو ۱۶۷ فٹ لمبی، ۵۲ فٹ چوڑی ہے۔ اینٹ اور نہایت اعلا درجے کے چونے سے یہ عمارت بنائی گئی جس میں فرش سے چھت تک لکڑی کا نام نہیں ہے۔ اس عمارت کو شاہانِ مغلیہ کی سنگین عمارتوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ لکھنؤ میں اُس کثرت سے سنگِ مرمر دست یاب نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن امام باڑے اور آصف الدّولہ کی دوسری عمارتوں کو دیکھیے تو ایک نئی خوش نمائی اور نرالی عظمت و شان رکھتی ہیں۔ امام باڑے کی لداؤ کی چھت، جو کڑادے کے بنائی گئی ہے، اتنی بڑی ہے کہ اُتنی بڑی لداؤ کی چھت، ساری دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ بھی دنیا کی اعجوبۂ روزگار کاری گریوں میں شمار کی جاتی ہے۔

آصف الدّولہ کی عمارتوں پر، یورپ کی عمارتوں کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ وہ اپنی نوعیّت میں خالص ایشیائی ہیں جن میں نمایشی نہیں، اصلی و حقیقی شان و شوکت پائی جاتی ہے۔ نوّاب آصف الدّولہ کے بعد یہ عمارتیں کس مپرسی میں پڑی رہیں۔ غدر کے بعد انگریزوں نے ان پر قبضہ کرکے، گرد و پیش کے مکانوں کو منہدم کردیا۔ اور سوا اُس جانب کے جدھر دریا ہے، باقی تینوں طرف میدان کرکے، امام باڑے کو قلعہ، اور رومی دروازے کو اُس کا پھاٹک بنالیا۔ اُس زمانے میں اس امام باڑے میں گورے رہتے تھے اس کے بڑے ہال میں سلح خانہ تھا اور اُس کے فرش پر بڑی بڑی توپیں دوڑتی پھرتی تھیں۔ مگر نہ کبھی زمین کھُدی نہ

در و دیوار کی کوئی چیپ اُکھڑی۔ اب سرکار انگریزی نے امام باڑے کو چھوڑ کے پھر مسلمانوں کے حوالے کردیا ہے۔ اُس کی مسجد میں ایک مجتہد صاحب نماز پڑھاتے ہیں اور امام باڑے میں تعزیہ داری ہوتی ہے۔

نوّاب آصف الدّولہ کی عمارتوں کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انھیں تعمیر ہوئے اگرچہ سوا سو برس سے زیادہ کی مدت گزر گئی، مگر آج تک اُسی عظمت و شکوہ اور اسی مضبوطی و پائے داری سے اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ نہ کوئی اینٹ اپنے مقام سے ہٹتی ہے اور نہ کسی جگہ چونے نے اینٹوں کو چھوڑا ہے بہ خلاف اُن کے، دیگر شاہانِ اودھ نے کروروں روپے صرف کرکے جو عمارتیں بعد کو بنوائیں، وہ قومی و ملکی وضع داری کے مفقود ہوجانے کے علاوہ نہایت کم زور ہیں۔ اور اگر وقتاً فوقتاً مرمّت نہ ہوتی رہتی تو آج تک کب کی منہدم ہوچکی ہوتیں۔

آصف الدّولہ، امام باڑے اور چھوٹی بھون کے متصل اپنے محل "دولت خانے" میں رہتے تھے۔ شہر کے باہر اور دریا پار، ہجومِ خلائق سے دور اور دُنیوی جھگڑوں سے الگ رہ کے مصروفِ عیش ہونے کے لیے بیبیاپور کا محل بنوایا۔ اکثر جب وہ سیر و شکار کے لیے جاتے تو اسی مکان میں قیام کرتے۔ اسی طرح چنہٹ میں ایک پُر فضا و فرحت بخش مکان، اور چار باغ اور عیش باغ میں کوٹھیاں بنوائیں۔ اور اُسی زمانے میں یحییٰ گنج میں اور اس کے متصل اصطبل بنے۔ پھر محلّہ وزیر گنج قائم ہوا جو آصف الدّولہ کے بیٹے وزیر علی خاں کی قیام گاہ ہونے کے باعث، انھیں کی طرف منسوب اور انھیں کی یادگار ہے۔

اب لکھنؤ میں حاکم اور فرماں روا کے مستقل طور پر سکونت پذیر ہوجانے کی وجہ سے، عام خلقت کا رخ لکھنؤ کی طرف پھر گیا۔ جو لوگ شجاع الدّولہ کے زمانے میں فیض آباد میں بس گئے تھے، انھوں نے فیض آباد کو چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آآکے بسنا شروع کیا۔ دوسری طرف دہلی کے لوگ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کے، سیدھے لکھنؤ

ہیں آتے تھے اور پھر جانا نصیب ہوتا تھا۔ خلقت کے اس ہجوم نے نئے محلّے آباد کرنا شروع کر دیے اس لیے کہ باہر کے آنے والوں میں سے جسے جہاں جگہ مل جاتی، آباد ہو جاتا، اور سینکڑوں نئے محلّے آباد ہوتے چلے جاتے۔

چنانچہ امانی گنج، فتح گنج، رکاب گنج، نخاس، دولت گنج، بیگم گنج، نوّاب گنج، خانساماں کا احاطہ، (جسے نوّاب آصف الدّولہ کے ایک خانگی داروغہ نے آباد کیا۔ اور افتتاح کی تقریب میں خود انھیں بلایا) ٹکیٹ گنج، ٹکیٹ رائے کا بازار (جو وزیرِ اعظم مہاراجا ٹکیٹ رائے کی جانب منسوب ہیں) ترمنی گنج، ٹکڑی یا ٹکلی، حسین الدین خاں کی چھاؤنی، حسن گنج، بادلی، بھوانی گنج، بالک گنج، کشمیری محلّہ، صورت سنگھ کا احاطہ، نواز گنج، تحسین گنج، خدا گنج، نگریا (جس کی نوّاب آصف الدولہ کی ماں بہو بیگم صاحبہ نے اسی دن بنیاد ڈالی، جس دن دریا پار خود انھوں نے علی گنج کی بنیاد رکھی تھی) عنبر گنج، محبوب گنج توپ دروازہ، خیالی گنج، جھاؤلال کا پُل (ان دونوں محلّوں کے بانی راجہ جھاؤلال، سلطنتِ اودھ کے وزیرِ خزانہ تھے) یہ سب دہ محلّے ہیں جو عہدِ آصفی میں بسے اور تعمیر ہوئے۔ اور انھیں دنوں دریا کے پار حسن رضا خاں نے حسن گنج بسایا۔

نوّاب آصف الدّولہ کی فیاضیوں کی خاص و عام میں شہرت تھی اور دُور دُور کے شہروں میں اُن کی داد و دہش کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ لوگ اٹھتے بیٹھتے عزّت و محبّت کے ساتھ اُن کا نام لیتے۔ اور اُن کے تمام ذاتی عیوب، فیاضی کے دامن میں چھپ کے، نظروں سے غائب ہو گئے تھے۔ اور عوام کو، نوّاب کی صورت میں، ایک عیش پرست فرماں روا نہیں بلکہ ایک بے نفس اور درویش صفت ولی نظر آتا۔ ہندو دکان دار آج تک صبح کو آنکھ کھلتے ہی جوشِ عقیدت سے کہتے ہیں "بیا آصف الدّولہ ولی"۔

اُسی زمانے میں جنرل کلاڈ مارٹن نام ایک بہت بڑا دولت مند فرانسیسی تاجر لکھنؤ میں آ کے رہ پڑا تھا۔ اس نے ایک نہایت ہی عالی شان کوٹھی کا نقشہ بنا کے، نوّاب

آصف الدّولہ کے ملاحظے میں پیش کیا۔ نوّاب نے اُسے اس قدر پسند کیا کہ اس کی قیمت میں دس لاکھ اشرفیاں دینے کو تیار ہو گئے۔ بیع کا معاہدہ تکمیل کو نہیں پہنچنے پایا تھا کہ نوّاب آصف الدّولہ نے سفرِ آخرت کیا۔ اور عمارت ہنوز تکمیل کو نہیں پہنچی تھی کہ خود مسیو مارٹن دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انھوں نے چوں کہ دولتِ بے پایاں چھوڑی تھی اور وارث کوئی نہ تھا، اس لیے مرتے وقت وصیّت کر دی کہ میری لاش اسی کوٹھی کے اندر دفن کی جائے تاکہ میرے بعد اسے حکم رانانِ اودھ ضبط نہ کر سکیں۔ اس عمارت کا نام انھوں نے کانسٹین شیا (قسطنطنیہ) قرار دیا تھا مگر عوام میں وہ آج کل "مارکین (مارٹین؟) صاحب کی کوٹھی" مشہور ہے اور دیکھنے کے قابل ہے۔ مرنے کے بعد وہ اسی کوٹھی میں دفن ہوئے۔ وہ مدرسہ آج تک جاری ہے۔ جس سے بہت سے طلبہ کو کھانا اور کپڑا ملتا ہے۔ مگر سنتے ہیں کہ مارٹن صاحب نے اُس اسکول اور اُس کے وظائف کو کسی مذہب اور قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کیا تھا، بلکہ وصیّت کی تھی کہ عیسائی، ہندو، مسلمان سب ہی یکساں طور پر اس سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب یہ مدرسہ صرف یورپین بچّوں کے لیے مخصوص ہے۔ کسی ہندوستانی کو وظیفہ ملنا درکنار، اس کی تعلیم میں بھی شریک نہیں کیا جاتا۔ شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ غدر کے زمانے میں جاہل و پُرجوش بلوائیوں نے قبر کھود کے مسٹر مارٹن کی ہڈیاں نکال لیں اور انھیں اِدھر اُدھر پھینک دیا۔ انگریزوں کو بعد تسلّط اتفاقاً ایک ہڈی مل گئی، جو پھر اُسی خاک میں دبا دی گئی۔ لیکن اُن بلوائیوں کے فعل کے ذمّے دار، عام ہندوستانی نہیں ہو سکتے۔

۱۲۲۷ھ محمدی (۱۷۹۸ء) میں نوّاب آصف الدولہ نے سفرِ آخرت کیا اور ان کی جگہ نوّاب وزیر علی خاں مسند نشین ہوئے، جن کی شادی کی دھوم دھام کا حال ہم بتا چکے ہیں مگر چار ہی مہینے میں ان سے ایسے بے ہودہ اور قابلِ نفرت حرکات ظاہر ہوئے کہ اکثر لوگ اُن سے ناراض تھے۔ خود بہو بیگم صاحبہ ان کے مقابل اپنے سوتیلے بیٹے، یمین الدّولہ نوّاب سعادت علی خاں کو زیادہ پسند کرتی تھیں۔ اِدھر اس خبر کی شہرت ہوئی کہ وزیر علی خاں،

آصف الدولہ کے بیٹے ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ آصف الدولہ کی نسبت بہتوں کا خیال تھا کہ پیدایشی عنین تھے۔

نواب سعادت علی خاں، آصف الدولہ کی مخالفت کے باعث، اُن کے زمانے میں مدتوں قلمرو سے باہر اور دور رہتے تھے۔ مدتوں کلکتے میں رہے اور ایک زمانۂ دراز تک بنارس میں قیام رہا۔ وزیر علی خاں کی نسبت یہ خیال قائم ہونے کے بعد، قرعۂ انتخاب سعادت علی خاں پر پڑا۔ وہ بنارس سے لائے گئے اور بیبیاپور کی کوٹھی میں خود گورنر جنرل بہادر نے دربار فرما کے، وزیر علی خاں کی معزولی اور نواب سعادت علی خاں کی مسند نشینی کا فیصلہ کیا۔ وزیر علی خاں فوراً گرفتار کر کے بنارس بھیج دیے گئے۔ جہاں انھوں نے طیش میں آکے، مسٹر چری کو مار ڈالا اور اس کی سزا میں گرفتار کر کے چنار گڑھ بھیجے گئے۔ اور وہیں مرے۔ ان کی مصیبتوں اور سرگردانیوں کا ایک بڑا بھاری قصہ مشہور ہے جس کا یہ مختصر مضمون متحمل نہیں ہوسکتا۔

(۵)

نواب سعادت علی خاں نے ۱۲۲۷ھ محمدی (۱۷۹۸ء) میں تخت پر بیٹھتے ہی آدھا ملک انگریزوں کی نذر کر دیا مشہور ہے کہ وہ سلطنت سے مایوس و ناامید بنارس میں پڑے ہوئے تھے کہ خبر پہنچی، نواب آصف الدولہ بہادر نے سفرِ آخرت کیا اور مسندِ حکومت پر وزیر علی خاں بیٹھ گئے۔ یہ سنتے ہی سلطنت کی رہی سہی امیدیں بھی خاک میں مل گئیں۔ اِس قطعی یاس کے عالم میں تھے کہ بنارس کے کسی یورپین حاکم نے آکے پوچھا:

"نواب صاحب! اگر آپ کو اودھ کی حکومت مل جائے تو انگریزی حکومت کو کیا دیجیے گا؟" جو چیز ہاتھ سے جا چکی ہو، انسان کے دل میں اس کی قدر ہی کیا ہو سکتی ہے؟ بے اختیار زبان سے نکلا: "آدھا ملک انگریزوں کی نذر کر دوں گا" یہ وعدہ سُن کے، اُس انگریز حاکم نے کہا: "تو آپ خوش ہوں اور میں آپ کو خوش خبری سناتا ہوں کہ آپ ہی فرماں روائے لکھنؤ منتخب ہوئے ہیں۔" سعادت علی خاں یہ مژدۂ غیر مترقبہ سن کے خوش تو ضرور ہوئے مگر اپنے وعدے کا خیال آیا تو ایک سناٹے میں آگئے۔ اور آخر تخت نشینی کے بعد اُس وعدے کے ایفا میں انھیں اپنی آدھی قلمرو بانٹ دینا پڑی، جس کا کانٹا زندگی بھر اُن کے دل میں کھٹکتا رہا۔

انگریزی تاریخوں میں اُن سے وعدہ لیے جانے کا تو ذکر نہیں ہے، مگر اس کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ نواب سعادت علی خاں کو چوں کہ انگریزوں نے تخت پر بٹھایا تھا، اس لیے انھوں نے اپنا آدھا ملک شکریے کے طور پر انگریزوں کی نذر کر دیا۔ بہر تقدیر، جو کچھ ہو، سعادت علی خاں کی تخت نشینی کے وقت اودھ کی حکومت آدھی رہ گئی۔ لکھنؤ کے پرانے لوگوں میں مشہور ہے کہ اسی کوفت میں سعادت علی خاں نے نہایت ہی کفایت شعاری سے کام لے کے، اور تحصیل وصول میں بے انتہا مستعدی و بیدار مغزی ظاہر کر کے، بائیس تیئیس کروڑ روپیا جمع کیا۔ اور انگلستان میں برٹش گورنمنٹ سے مراسلت کر کے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستان کی حکومت کا ٹھیکا بہ عوض ایسٹ انڈیا کمپنی کے، اُن کو دے دیا جائے۔ اور معاہدے کی تکمیل ہونے ہی کو تھی کہ اُن کے سالے نے کسی سازش میں شریک ہو کے، زہر دے دیا۔ اور وہی مثل پوری ہوئی کہ ع آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند۔

یہ اور اسی قسم کے بیسیوں واقعات مشہور ہیں، جن کا ثبوت سوائے افواہی روایتوں کے اور کچھ نہیں مل سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سعادت علی خاں اس قدر حزم و احتیاط اور منتظم واقع ہوئے تھے کہ اُن کے سے حاکم نے قلمرو کا کوئی جز آسانی سے نہ دیا ہوگا۔ دوسرے اُن کے طرزِ عمل اور ان کی پالیسی میں ایک ایسی مضطربانہ ہوشیاری اور پُراسرار بے قراری نظر آتی ہے کہ چاہے پتا نہ چلے، مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑا کام کرنے والے تھے، اور ان کے تیور بہت ہی پُرمعنی تھے۔

ملک کو بانٹ دینے کی وجہ سے انھیں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ